۵/
۱۱۸۴

باسمه تعالی

خداشناسی

از

سید مجتبی موسوی لاری
ایران

مترجم
نجم عشروی

● نام کتاب ــــــــ "خدا شناسی"
● مصنف ــــــــ علامہ سید مجتبیٰ موسوی لاری
● مترجم ــــــــ جناب نجم عشروی
● خطاط ــــــــ قلبی حسین رضوی
● تعداد ــــــــ ١٠ ہزار
● تاریخ ــــــــ رمضان المبارک ١٤٠٥ھ
● ناشر ــــــــ دفتر گسترش فرهنگ اسلامی (خارج از کشور)
● نوبت چاپ ــــــــ چاپ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

"خداشناسی" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اصلِ کتاب "مبانی اعتقادات دراسلام" علامہ سید مجتبیٰ موسوی لاری کی متعدد تصنیفات میں سے ایک ہے۔ اسی گراں قدر کتاب کے ایک مختصر سے حصہ کا ترجمہ ایف۔ جے۔ گولڈنگ نے بزبان انگریزی کیا۔ اس ترجمہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ صاف ستھری زبان، بامحاورہ ادائگی، عمدہ طرزِ گویا ہر خوبی ہے۔ زبان وطرزِ بیان سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ ترجمہ اصطلاحی ہے۔

میں نے اسی ترجمہ کا ترجمہ کیا ہے۔ اصطلاحی ترجمہ سے عمداً گریز کیا اور زبان والفاظ سے قریب رہنے کی کوشش کی تاکہ اصل کتاب سے دوری زیادہ نہ ہوسکے۔ یہ کہئے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہے۔ ترجمہ بجائے خود غلطیوں کا دعوت نامہ ہوتا ہے چہ جائیکہ ترجمہ کا ترجمہ۔ میں اس فن کا ماہر بھی نہیں۔ لہذا غلطیوں کا امکان بھی زیادہ ہے۔ میں نے تو اپنے محترم اور دیندار رفیق ڈاکٹر شکیل اختر کے حکم پر ترجمہ کا بیڑا اٹھایا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم

علامہ مجتبیٰ موسوی لاری کی شخصیت دنیائے تصنیف و تالیف خصوصی طور پر عالم اسلام میں محتاجِ تعارف نہیں۔ میں اگر کچھ کہوں تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ اس مختصر سے رسالہ ہی سے آپ حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جناب ممدوح میں کتنی علمی سربلندی اور کیسا تبحرِ علمی ہے۔ اس مختصر سے رسالہ میں بہت سی اہم باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

انسان و عقیدہ کا تعلق

دین و فطرت کا رشتہ

ضرورت دین و رہبرانِ دین

منطقی اور سائنسی دلائل۔

حواس کی حدِ پرواز، حواس کی خامیاں، سائنس کی بے بسی، مادیت کے اسباب، سائنس دانوں میں بے دینی کی وجوہات، سائنس دانوں کی غلط فہمی اور برٹرانڈ رسل جیسے سربرآوردہ فلسفی کی غلط فہمی کا ازالہ وغیرہ۔

علامہ موصوف کی تصنیف سے میری معلومات میں کافی اضافہ محسوس ہوا۔ یہ "خدا شناسی" بھی انقلابِ اسلامیِ ایران کی رہینِ فیض ہے۔ اسی انقلاب کی برکتوں سے بلند پایہ کتابیں فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں مل سکی ہیں۔

نجم عشروی

خداشناسی

انسان کی معلومات کا دائرہ سائنس اور ٹکنالوجی کی طرح اعتقادات کے میدان میں بھی ارتقائی منزلوں سے گذرا ہے اور اس نے صدیوں کی مسافت طے کی ہے۔ مذہب کا وجود تاریخ کے ماقبل سے ملتا ہے اور یہ ہمیشہ انسانی برادری کی خاص دلچسپی اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔ انسان کی فکری اور روحانی ترقیوں کے قدم بہ قدم زبانیں، نغتیں اور وسائل زندگی وغیرہ نے بھی تکامل کی منزلیں طے کی ہیں۔ انسانی حالات کے تحت ان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ مذاہب بنتے رہے اور معبودوں کی کثرت ہوتی چلی گئی۔ ان میں سے بعض خیالی مجسمہ کے طور پر پیش کئے گئے بعض کو جانوروں کی شکل دی گئی اور بعض کو انسانی ہیولیٰ عطا کیا گیا۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ تصور طبعیات و روحانیات اور پھر مشاہدات کی منزلوں کو طے کرتا ہوا حقیقت واقعی "توحید" تک پہونچا۔

بحث

علم اور دین دونوں ہی کی ابتداء میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اب یہ بات معرض آتی ہے کہ روحانیت اور سائنس یعنی عقائد و مشاہدات میں کونسی راہ دشوار تر ہے۔ ظاہر ہے کہ اشیاء متخیلہ کے مقابلہ میں قابل دید اشیاء کا قبول کر لینا کہیں آسان ہے۔ عالم شہود کا مان لینا سہل اور عالم معقول کا یقین مشکل تر ہے۔ انسانی دماغوں کے لئے بڑی رفعت درکار ہے اس مقام و منزل تک پہونچنے کے لئے جہاں خدا کے متعلق کوئی علم حاصل ہو سکے۔ ہمارے سامنے آفتاب ہے

کہ جو ایک درخشاں ترین" موجود" ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے مرکبات، عناصر اور ساخت کی تشریح فوراً ہی طے نہیں ہو گئی۔ بہتیرے مفروضے وضع ہوئے اور باطل قرار پائے۔ نئے دعوے آئے اور مسترد ہوئے۔ ایسا بارہا ہوا تب جاکر کہیں کوئی بات طے ہوئی۔ پھر بھی کچھ حقیقتیں اندھیرے میں ہیں۔ یہ اندھیرا فکرو نظر کی تھکاوٹ یا خرابی کے باعث نہیں ہے۔ بلکہ اسے یوں کہنا چاہئے کہ انسان کی فکر و نظر ابھی اسی منزل تک پہونچ پائی ہے۔ سائنس کی موجودہ منزل اس کی منزل جیسی نہیں ہے۔ درحقیقت سائنس یا دیگر علوم مادی پہلے اسی پستی کی سطح پر تھے اور انہیں دیومالائی اور اساطیری ادوار سے ہو کر گزرنے ہیں، جس سطح اور جن ادوار سے عقائد اور فلسفہ کو ہو کر آنا پڑا ہے۔

انہیں فرسودہ اور دیومالائی قصوں سے وحشی قبائل کو عقیدے ملے۔ ان کے اخلاقی اقدار کو بلندی حاصل ہوئی۔ رفتہ رفتہ علوم اور تجربات نے انسان کو اس سطح پر پہونچا دیا کہ اسے نظمِ تخلیق اور قانون فطرت میں نیز ان کے درمیان اتحاد اور مناسبت میں بالکل واقعی مطابقت کو محسوس کر لینے کی صلاحیت حاصل ہونے لگی۔ ان حقائق سے انسان نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ ہر شے ایک حقیقی خالق کے حکم کی پابند ہے۔ وہ جو تمام موجودات سے قطعی مختلف اور تمام نظر آنے والی موجودات سے بالکل جدا ہے۔ اب انسان نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہر اثر کے پیچھے ایک انفرادی سبب یا موثر ہوتا ہے اور ہر مظہر کے لئے ایک الگ اصول تخلیق

خیالات میں مزید ترقی ہوئی۔ ابتدا میں انسان کا خیال یہ تھا کہ یہ مخلوقات یا ان کا خالق جانوروں کی شکل یا ساخت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ یہ خیال

آرائیاں انسانی ہیولے اور پھر روح تک پہونچیں اور پھر ذہنی طور پر اس کی رسائی نے رفعت پائی اور وہ اس قابل ہوگیا کہ وہ اپنی فکر کو وحدانیت تک پہونچا سکا۔

مختلف ادوار اور علاقوں کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ساری ترقی انسان کی اصل فطرت کا مظاہرہ ہے۔ یہ ترقی زبان اور فکر کی ترقی کے بالکل برابر اور متوازی رہی ہے۔

جو شئے انسان کو تمام حیوانات سے الگ کرتی ہے وہ اس کی عقل ہے۔ اس کا اظہار ایک نوزائیدہ بچّے سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے جیسے اس کا جسم نشونما پاتا ہے، اس کے قوائے دماغ بھی بڑھتے ہیں۔ یہ ترقی اس کے شعور، انعکاس، تقابل، استنباط، تصور اور قوت ادراک میں یکساں طور پر آتی ہے۔ لہذا طبعی جسم کی طرح ذہن کی تربیت اور نگرانی بھی ضروری ہوتی ہے۔ دنیا اور دنیا کی حکمراں جماعتوں کی ترقی کا انحصار خود ان کی اجتماعی کوشش پر ہوتا ہے بالکل یوں ہی ذہنی، اخلاقی، فکری اور فلسفہ کے ارتقا کا انحصار بھی ذہین اقوام کے روابط اور ان کی متحدہ کوششوں کا مرہون منت ہے۔

انسان نے لاکھوں برس کے اپنے عرصۂ وجود میں افکار کا عظیم خزانہ جمع کرلیا۔ صدیوں کی منازل طے کرنے کے بعد رفتہ رفتہ اس میں وسعت گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی اور آخر کار افکار کے اتنے ذخائر جمع ہوگئے کہ یہ عقیدۂ و نظریات کی شکل میں مرتب ہونے لگے۔ یہ ایک ایسی عظیم ترقی تھی جو ایک نئے دور کو وجود میں لائی۔ اس نے انسان کو یہ بات سمجھا دی کہ ہر وجود کا ایک مقصد ہے۔ پھر تو اس نے ان اقدار کی تلاش شروع کردی جن کی شناخت سے

پہلے حاصل نہیں تھی۔

تاریخ میں تحقیق کی بنیاد پر سائنس کو بھی اقرار ہے کہ دینی رجحانات انسان کی قدیم ترین خصوصیات میں سے ہیں۔ اس اقرار کے باوجود ان لوگوں میں دین کی ابتداء کے متعلق اختلافات ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نوعِ انسانی نے سختی حالات کے سامنے اپنی کمزوری اور اپنی ناطاقتی کے سامنے طبعی قوت کو محسوس کرلیا اور اس طرح مذہب کی پناہ میں آگیا۔

لیکن حقیقتاً کمزوری، دین کی وضاحت کرنے کی اہل نہیں ہوسکتی کیونکہ ضعف کبھی منبع اعتقاد نہیں بن سکتا۔ مستحکم ایمان والے کمزور اور بزدل ہرگز نہیں ہوتے۔ وہ تمام پیغمبر اور فقیر منش افراد جنھوں نے دین کی تلاش میں انسانیت کی رہنمائی کی ہے، کسی بھی فرد کے مقابلے میں بلکہ تمام لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ قوت فیصلہ، قوتِ ارادی اور دینی یقین کے حامل تھے۔ آخر وہ کون سی طاقت تھی جس نے ان دینداروں کو انسانیت کے باغیوں، برائیوں اور بدکرداریوں کے خلاف مقدس جدوجہد کرنے کیلئے مسلح کردیا؟ کیا مادی حصول اور سیاسی کامرانیوں کی توقع نے انھیں تلخیٔ حادثات اور قتل و غارت گری کو برداشت کرلینے کی صلاحیت بخشی؟ ہرگز نہیں!

لہٰذا یہ احساسِ ناتوانی نہیں جس سے ایمان کو قوت ملی ہے۔ اگر یہ رہبرانِ دین کمزور اور نااہل یا بے صلاحیت ہوتے تو نوعِ انسانی کو مذہب کی راہ پر ہرگز گامزن نہیں کراسکتے تھے۔

انسان اس دنیا میں جتنی کامرانیاں حاصل کرتا ہے اور کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانے کی جس قدر صلاحیت اس میں پیدا ہوتی جاتی ہے اس کا یقین و ایمان اتنا ہی مستحکم ہوتا ہے۔

دین ہرگز بیماری یا فسادِ فکر و نظر نہیں۔ جو شخص خود اپنی ذات اور دنیا میں حقیقت کا جویا ہوتا ہے اس سے بہتر صحت مند دوسرا نہیں ہو سکتا بیماری کے سبب انسان کی نظریں اس کی اپنی تکالیف تک محدود ہو جاتی ہیں اور وہ دوسرے حقائق کو بھول بیٹھتا ہے۔ اس بات کی تفصیل یہاں محال ہے۔ فطرت کی ہر ایک خصوصیت کا مطالعہ کسی ایک رسالہ میں نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی مختصر رسالہ ان کے اسباب و اثر کو بیان کر سکتا ہے۔

ایمان و یقین کے خزانہ کے عظیم ذخائر کی فہرست بھی کسی ایک رسالہ کے ظرف میں نہیں آسکتی۔ کسی شئے کے لئے کوئی تعریف بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ مثال کے لئے محبت ہے جو دوسروں سے ہمدردی، جذبِ حسن یا ایثار سے یا ان تینوں کے مجموعہ سے عظیم تر ہے اب وہ کون سی داستان یا رسالہ ایسا ہے جو اس کی گہرائی کو ناپ سکے، اس کی حقیقت کو پرکھ سکے اور یہ بتا سکے کہ محبت اپنی مکمل حیثیت میں کیا ہے؟ تو پھر اس کائنات کے وجود اور اس کی حقیقت کی وضاحت کس قدر ہو سکتی ہے؟

علمِ سائنس اور فنِ دواسازی بھی مہمل خیالات اور جادوئی کرشمہ سازیوں سے ہو کر ہی ایک مفید فن کی منزل تک پہونچا ہے۔ علمِ کیمیا بھی خیالی پلاؤ پکانے کے دور سے شروع ہو کر جدید سائنس کی منزل تک

آسکا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ریسرچ اور تحقیق کا آغاز مفروضوں اور کہانیوں سے ہوا۔ پھر مختلف تجربات اور غلطیوں کے ازالہ کے بعد چند حقائق دستیاب ہو سکے۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں "مذاہب مفروضات کا پلندہ ہیں" چلئے ہم مان لیتے ہیں، لیکن یہ بات کوئی لائق اعتنا دلیل نہیں ہے۔ اسی بات کا سہارا دشمنانِ خدا، وجود پروردگار عالم سے انکار کے ذیل میں لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ وجودِ خدا کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکے۔ ان پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ یہ غلطیاں محض تلاشِ حق کی راہ میں انسانی کج فکری سے ابھری ہیں۔

برٹرانڈ رسل کہتا ہے کہ "مذہب کی بنیاد انسانی خوف پر مبنی ہے۔ یہ غیر مرئی خوف، خوفِ مرگ، خوفِ تباہی اور بھوت پریت کا خوف یا جیسا بھی خوف ہو[1]۔" لیکن اپنے قول کے ثبوت میں وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا اور نہ اس بات کا جواب ہی دے پایا کہ "اگر خوف ہی وہ شئے ہے جس نے انسان کو خالق کی جانب مائل کر دیا ہے تو اس سے کیا ثابت ہو جاتا ہے کہ خالق کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں؟ اگر خوف ہی کے باعث ایک پناہ کی تلاش میں انسان نے خدا کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں تو بھی کیا اس سے خدا کی حقیقت غلط ثابت ہو جاتی ہے؟ کیا ہر وہ حقیقت جسے انسان نے خوف کے سبب دریافت کیا ہے اُسے برٹرانڈ رسل بے حقیقت گردانے گا؟ اگر شدتِ

---

[1] میں عیسائی کیوں نہیں ہوں؟ ص ۳۷ — WHY I AM NOT A CHRISTIAN? P. 37

تیرگی کے خوف سے انسان نے بجلی دریافت کرلی تو اس خوف کی بناء پر بجلی کی حقیقت میں کوئی کمی واقع ہو گئی ؟"

سچ یہ ہے کہ مشکل یا پریشانی کے وقت ایک خدائے علیم و قادرِ مطلق پر ایمان بہت وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ دوسرا موضوع یہ سوال ہے کہ "کیا ایسی کسی پناہ کی تلاش کی تحریک انسان میں اولاً خوف ہی سے ابھری" ان دونوں موضوعات کو الگ الگ رکھ کر دیکھنا بہتر ہے۔

تلاشِ رب

انسان بہت سی بدیہی تصورات کے ساتھ پیدا ہوا ہے اور یہ تصورات ناقابل انکار حقائق ہیں جو جبلی طور پر ودیعت کئے گئے ہیں۔ انہیں کسی خارجی ہدایت نے اجاگر نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ خارجی ہدایتوں نے انھیں مزید مستحکم کیا ہے۔ یہ تصورات تعلیم یافتہ اور جاہل اشخاص میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً "کل جزو سے بڑا ہے۔" اس بات کو واضح کرنے کے لئے کسی خاص ہدایت یا تربیت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے۔ منطق، سائنس یا فلسفہ انھیں بدیہیات کے بروئے کار لانے کا ثانوی نتیجہ ہیں۔ بنیادی حقائق میں انسان اسی وقت شک کرنے لگتا ہے جب وہ پہلے سے شناخت شدہ ان بدیہی امور کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ چند مکاتب فلسفہ غلط تفہیم کے شکار "سماجی" کے وجود سے بھی انکار کرتے ہیں۔ خدا پر ایمان انسان کے طبعی شعور میں داخل ہے۔ اس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے ذہن کو تمام دینی اور لادینی خیالات سے خالی کر کے تعصب کی عینک اتار کر کائینات اور تخلیقات پر نظریں جما کر غور کرتا ہے۔ وہ خود کو متحرک کرہ کے وجود میں پاتا ہے اور وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کا آغاز ایسے مقام اور نقطے سے ہوا ہے جس کا انتخاب خود اس نے نہیں کیا۔ پھر وہ چار و ناچار ایک ایسی منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے جسے خود اس نے منتخب نہیں کیا اپنی

ذاتی کد و کاوش اور خواہش و مرضی کے وہ کائنات کے نظم میں موجودات کے جلوس کا ایک جزو بنا ہوا ہے۔ غور و فکر کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس نظام اور خود اس کے درمیان ایک رشتہ یا ایک ربط ہے۔ اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس پورے نظام اور نظارۂ دنیا کے پیچھے ایک ان دیکھی طاقت کارفرما ہے جو موجودات اور ان کے نظم و صحت پر پوری قدرت رکھتی ہے۔ اس میں ارادہ و اختیار کا کمال ہے۔ خود انسان ، جس کی حیثیت اس عظیم اور پیچیدہ کائنات میں ایک مختصر ذرہ کی سی ہے، صاحب علم و ارادہ و اختیار ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس قدرت کاملہ میں ارادہ، و علم اور اختیار نہ ہو۔ وہ صاحب ارادہ، عالم، قادر ہے۔ وہ ناقابل دید ہے۔ بغیر کسی امداد یا تعاون اور مشورہ کے وہی خلق کرتا ہے، عالم وجود میں لاتا ہے، باقی رکھتا ہے اور آخر کار فنا کر دیتا ہے۔

انسانی دماغ کا یہ جبلی اور بدیہی فیصلہ ہے جس کی تصدیق غور و فکر کے بعد انسان کر چکا ہے۔ اور وہ یہ کہ بغیر بنانے والے کے کوئی شئے نہیں بنتی۔ بغیر فاعل کے کوئی فعل صادر نہیں ہوتا۔ یہ فطری رجحان ایک نوزائیدہ بچے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ بچہ جس نے ابھی تک کوئی آواز نہیں سنی کوئی حرکت نہیں دیکھی، کسی آواز پر منبع آواز کی جانب یا محرک شئے کی جانب فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہی خیال علمی اور تجرباتی سائنس کا بھی ہے کہ کوئی اثر بغیر سبب کے نہیں ہوتا۔

سببیت کے اصول یا قانون سے کوئی بھی بری نہیں۔ تمام علوم سائنس،

ارضیات، طبیعات، کیمیا، انساب، اقتصادیات یا باقی دیگر علوم، ہر ایک میں یہ اصول سببیت کارفرما نظر آتا ہے تاکہ یہ تعین کریں کہ ان کے پیچھے کونسا عمل کارفرما ہے، ان میں کس طرح کا ربط ہے اور یہ ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ علم ریاضی جو (دو اور دو چار کی مانند) صحیح ترین علم ہے حیثیت مشکلہ (THEOREMS) بناتا ہے، اس کے ثبوت مہیا کرتا ہے اور عروض مساویت (EQUATIONS) ایک دوسرے سے تعلق، قوانین، احصائے تفریق (DEFFERENTIALS) اور غیر مکسر عدد (INTEGRALS) وغیرہ جیسے نتائج مرتب کرتا ہے۔ اب اگر کوئی سائنس دان اصول ریاضی کا لحاظ کئے بغیر اپنی مرضی سے عرض مساوی میں جمع کے نشان (+) کی جگہ پر کسر (-) کا استعمال کرے یا کوئی غلط ھندسہ لکھدے تو اس سے خود اس سائنس دان کی نااہلی اور جہالت ثابت ہو جائے گی۔ اس کا انکشاف تحقیق سے ہوتا ہے۔ درحقیقت انسان کی تمام ترقیاں اسی تحقیق پر منحصر ہیں۔ جس نے مشاہدہ میں آنے والے نتائج کے اسباب وعلل کی نقاب کشائی کی ہے اور انسان کے استعمال کے لئے فطرت کے انھیں قوانین کو پیش کیا ہے۔

کسی شئے کے اپنے آپ خلق ہو جانے کی کوئی مثال ہمیں فطرت میں مل جاتی تو ہمیں یہ قیاس کرنے کا حق ہو جاتا کہ دوسرے میدان میں بھی اسی طرز کے مظاہر کا امکان ہے لیکن قانونِ فطرت یہی ہے کہ کوئی بھی مادہ بالکل ختم نہیں ہوتا اور نہ کوئی توانائی بالکل نابود ہوتی ہے۔ نہ کوئی نیا مادہ پیدا ہوتا ہے نہ کوئی نئی توانائی پیدا ہوتی ہے۔ تجرباتی سائنس نے بھی اسی

قانون کے ثبوت فراہم کئے ہیں۔ قانونِ فطرت کے خلاف کسی شئے کے موجود ہو جانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے تجربات، ادراک اور شعور اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ بغیر سبب کے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ امر طے شدہ ہے۔ جو بھی اس سے مختلف تصور قائم کرتا ہے وہ سائنسی قوانین فطری اصول، عقلی نتائج اور قانونِ الٰہی کو گویا اپنے پیروں تلے روند ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

کسی حد تک بدیہیات سے متعلق انسانی جبلت حیوانی جبلت سے مشابہ ہے۔ جب وہ اپنی بنیادی محدودیت کے دائرہ سے باہر نکلتی ہے تو اس صلاحیت میں حواس کی سرحدوں کو پار کرکے مختصر ترین اور لامتناہی وجود کی تفتیش کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر معروف اور ناقابل دید وجود کو معلوم کر لینے کی استعداد بہم پہونچتی ہے۔ ان سے عقل کی رہنمائی ہوتی ہے اور ہر مادی حصول کی خواہش اور لالچ کو برطرف کرکے انسان حق و صداقت سے ملحق ہو جاتا ہے۔ یہ باطنی بصارت ہے۔ اس پر کسی قوم و قبیلہ کی اجارہ داری نہیں۔ اس کی حدیں بھی مقرر نہیں ہیں اس میں نہ مغرب کی شرط ہے نہ مشرق کی، ہر انسان میں ایسے قوانین موجود ہیں۔ ان کا تعلق کسی مسلّط کردہ عقاید و نظریات یا فلسفیوں اور سائنسدانوں نیز مقدس رہنماؤں کی تعلیم اور معاشرتی ماحول کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ جبلی شئے ہے۔ بالکل ماں کی ممتا کی طرح ایک فطری تقاضہ۔

پھر بھی تمدن اور ماحول کے اسباب جو ثانوی تاثرات میں شمار

ہوتے ہیں، بدیہی حقائق کے جبلی شعور کو متاثر کردیا کرتے ہیں۔ کبھی ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی جڑیں تک کاٹ ڈالتے ہیں۔ جو لوگ اپنی اصل طینت پر مستحکم اور ثابت قدم ہوتے ہیں وہ مقامی رواسم اور تاجرانہ ذہن رکھنے والے طبقہ کے خود پسند نظریات سے ہرگز متاثر نہیں ہوتے۔ ان پر مروجہ زبان اور فیشن کا رنگ نہیں چڑھتا جو اپنے داخلی علم پر قائم رہتے ہیں، وہ باطن کی صدا واضح طور پر سنتے ہیں۔ اپنے عمل سے سچ اور جھوٹ کی وضاحت کردیتے ہیں۔ حق و باطل میں عقیدۂ فطرت کے تحت تمیز کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایسے لوگوں میں الحاد کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے کیونکہ خالق کا تصور انسان کی فطری جبلت میں داخل ہے۔ ایسی کسی شخصیت کو آپ یہ بتائیں کہ یہ کائنات محض اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ یا حادثات کا نتیجہ ہے۔ اس کے سامنے آپ اپنے دعوے کے تمام مثبت پہلوؤں کو تمام تر خوبیوں کے ساتھ منطقی دلائل اور فلسفیانہ بیان کی روشنی میں پیش کردیں لیکن اس کے عقیدہ کے استحکام میں جنبش بھی نہیں ہوگی، وہ اپنی جبلی صلاحیت کی آواز اور بدیہی تیقن کے سبب تمام دلائل کی تردید کردے گا۔ ضمیر کی آواز (DEMON) جس نے سقراط کی رہنمائی کی تھی اسلام میں اسی کا نام "فطرت" ہے۔ یہ وہی داخلی یا جبلی شعور ہے جس کے ساتھ انسان پیدا ہوتا ہے۔

لیکن نام نہاد علومِ انسانی خیالات میں ایسا جالا تنتا ہے جس میں آ پھنسنے والا شکوک و شبہات میں گرفتار ہوجاتا ہے اور اسی کا قیدی بن کر رہ جاتا

ہے۔

یہ مفاد پرست گمراہ مغرور نیم ملا محدود نظر افراد آنکھوں کے سامنے رنگا رنگ شیشوں کی پٹیاں سی کھڑی کر دیتے ہیں جو فکر کے دریچوں کو بند کر دیتی ہیں اور ضمیر کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ایسی تعلیم پر فخر کرنے والے اسی رنگ سے کائنات کو رنگین بنا کر اپنے ہی فکر و نظر کے آئینہ میں پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کے پیش کردہ سائنسی علوم اور صنعت و حرفت میں جھلک ملتی ہے اور وہ اسی تصویر کو حقیقت کہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ عقل و خرد اور خیال و وہم کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔

لیکن اس بیان کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اپنے بنیادی تصورات میں کوئی شخص اتنا سخت گیر اور مستحکم ہو کہ وہ تمام تاثرات سے قطعی آزاد ہو جائے اور مثبت عاقلانہ نتائج کو بھی رد کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی کو بھی تکنیکی کرشموں کے فریب میں آکر خود پسندی اور محدود علمیت کا غلام نہیں بن جانا چاہیئے بلکہ آسے ہر نئے علمی اضافہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اضافہ انسان کی کاوش کا ایک نیا زینہ ہے۔ اسے ہر نئے زینہ پر قدم جما کر بلند تر مقاصد کی جانب کوشاں ہونا چاہیئے۔ اسے موجود طرز سخن اور خیالات کی چہار دیواری میں اسیر ہو کر جامد و غیر متحرک نہیں ہو جانا چاہیئے

ہم اس ضمیر کی آواز اور پیدائشی حس کی وضاحت کے لیے فارسی زبان میں عربی زبان کی لفظ "فطرت" استعمال کریں گے۔ برٹرانڈ رسل کا قول کہ "خوف

ہی وہ زمین ہے جس سے مذہب کا بیج روئیدہ ہوتا ہے۔" اس حقیقت کا انکار ہے کہ "بوقت مشکل فطرت انسان کی امداد کے لئے تیزی سے آگے بڑھتی ہے" برٹرانڈرسل متقدم کو موخر قرار دیتا ہے۔ یہ خوف نہیں ہے کہ جس سے مذہب جنم لیتا ہے بلکہ یہ مذہب ہی ہے جو خوف کے موقع پر انسان کی مدد کرتا ہے۔ جب انسان مسائل اور مشکلات میں گھر جاتا ہے، جب تمام مادی اسباب و وسائل منقطع ہو جاتے ہیں، جب زندگی کے تمام امکانات مفقود ہو جاتے ہیں اور بحر مصائب میں اتنی طغیانی ہوتی ہے کہ موت سامنے آ کھڑی ہوتی ہے تو "فطرت" کی باطنی آواز اسے ایک غیر مرئی طاقت کی پناہ حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی آواز کے سہارے انسان واحد و یکتا خدا کا سہارا لیتا ہے، جو تمام طاقتوں سے عظیم اور زبردست قدرت والا ہے۔ موج حوادث کی زد میں آنے والا محسوس کرتا ہے کہ "وہ" ایسا رحیم ہے کہ جو اتنا کچھ عطا کر دیتا ہے، جو ہمارے تصور اور ہماری تمنا سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ایسا دستِ امداد ہے کہ انسان کو فنا کے خطرات اور موت کی پہونچ سے باہر کر دیتا ہے۔ یہ تجربہ انسان کو عزم عطا کرتا ہے اور انسان اسی عزم کے ذریعہ اپنے پورے وجود اور دل و روح کی گہرائیوں کے ساتھ وقتِ ضرورت بھی اور شکر کے موقع پر بھی اسی خدا کی پناہ کی جانب بڑھتا ہے۔

ہاں، درحقیقت اس دنیا میں اپنی تنہائی کا احساس ایک انسان کی باطنی شمع کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے انسان میں بیداری اور ایمان باللہ کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔

اس باطنی روشنی کی چھوٹ سے انسان کے گوشۂ دل میں ایک تقویت کا احساس ہوتا ہے۔ خود مادیت کے دلدادہ جو اپنی کامیابی، شہرت اور اثر ورسوخ کے دنوں میں مدہوشی میں مبتلا ہو کر حقائق کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں اور وہ خدا کی بے پناہ قدرت کو دیکھ ہی نہیں پاتے۔ لیکن جب مصیبت، شکست اور بربادی سے دوچار ہوتے ہیں تو سیدھے اسی قادرِ مطلق کی پناہ کی طرف دوڑتے ہیں جس کا پہلے وہ انکار کیا کرتے تھے۔ صراطِ مستقیم سے دور شر اور گمراہی کی زندگی بسر کرنے والے بھی مشکل سے تنگ آکر اسی خالق اور منبع قدرت کی پناہ ڈھونڈھتے نظر آتے ہیں اور دل و روح کی گہرائیوں کے ساتھ اس طاقت سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

اس طرح الحاد و شرک اپنے تمام طور طریقوں میں جاہلانہ بت پرستی سے لیکر جدید ترقی پسند مادیت تک تمام اسی فطرت سے بغاوت کا نتیجہ ہیں۔ یہیں خدائی رہبری کی روشنی اور ہدایت کی سرگوشی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عقل و فطرت کو قوت و جلا مل سکے اور انہیں غلطیوں سے بچایا جاسکے اور خوف کے عالم میں جمود اور اسیری سے محفوظ رکھا جاسکے۔ نیز فطرت کو متحرک رکھا جاسکے۔

پیغمبروں کی تبلیغ اسی اندرونی حرکت یا بےچینی کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ "فطرت" کی خداجوئی اسی بےچینی میں مضمر ہوتی ہے۔ پیغمبر کی آواز پر لبیک کہنے والے وہی لوگ تھے جو روشن ضمیر اور زندہ فطرت کے حامل تھے پیغمبروں کے مخالفین میں وہی لوگ رہے ہیں جو خود فریبی کا شکار تھے۔

اپنی ذہانت پر مطمئن، اپنے علم پر مغرور اور اپنی حکومت و اثرات پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔ ایک محقق کا کہنا ہے۔ "اخلاقیات میں بھی ضرورت اور اس کی فراہمی (SUPPLY & DEMAND) کا قانون کارفرما ہے۔" اگر دین انسان کی اہم ترین باطنی ضرورت نہ ہوتا تو پیغمبروں کی طرف سے ہونیوالی سپلائی غیر مقبول ہو جاتی ہمیں تو یہی دیکھنے کو ملا ہے کہ پیغمبروں کی طرف سے کی جانیوالی سپلائی کو ضرورتمندوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ یہ سپلائی لاتعداد ماننے والوں کے لیے ضرورت بن گئی۔ یہ حقیقت اس بات کی گواہی ہے کہ عقیدہ نوعِ انسانی کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبروں کی تعلیمات کے تحت وحدہٗ لاشریک کی عبادت بھی ضرورت بن گئی۔ دنیا ان کے لئے بیکار نہیں رہی۔

بت پرستی، آفتاب و ماہتاب، ستاروں یا اور دوسری چیزوں کی پرستش دقیانوسی اور خرابیوں سے پُر غیر ترقی یافتہ طریقے پہ سہی لیکن اس بات کی گواہی ضرور ہے کہ دلِ انسان کو خدا کی تلاش ہمیشہ رہی ہے۔ ایسا خدا جس کی عبادت کی جاسکے۔ اصنام پرستی کا ابتدائی دور بھی اس ابتدائی دور ہی جیسا تھا جس میں سائنس کو ساحرانہ مفروضوں کا سامنا تھا۔ ذہنی اختراعات کو بغیر تحقیق و آزمائش کے یقینی سمجھا جاتا تھا۔ اور بدیہی تصورات کا نتیجہ گردانا جاتا تھا۔ پھر بھی قدم اسی کے جانب بڑھتے تھے جو واحد و یکتا اور تمام موجودات کا خالق ہے۔ اسی کی جانب بڑھنے کی اللہ نے اجازت دی ہے تاکہ رحمتِ الٰہی کے فرحت بخش چشمے کی طرف دل مائل ہوتے رہیں۔ اس سراب میں انسان کو خوشگوار آبشار کی ٹھنڈک ملتی رہی ہے اس راہ میں غلطی بھی ہو یا یہ راہ خارجی بھی ہو لیکن انسان کی داخلی یا باطنی

خصوصیت پر اثر ضرور ہوتا ہے ۔ یہیں پر انسان کی دینی جبلی بے چینی بسی ہوئی ہے جسے خالص عقیدۂ وحدانیت میں اطمینان ملتا ہے ۔

گذشتہ صدی یعنی اسلامی دور کی چودھویں صدی (جو ۱۹۷۹ء میں ختم ہوئی) مذہبی تجربات کے آئینہ میں علما ومفکرین کے لئے تحقیق کا موضوع رہے ہیں۔ حالات وضرورت کے تحت بہت سی دریافتیں بھی ہوئیں جو بہت اہم ثابت ہوئیں ۔ اگرچہ ان میں اب بھی تحقیق وجستجو کے لئے دلائل اور مباحثہ کے نکات پائے جاتے ہیں ۔لیکن ان میں انتہائی قیمتی اور مفید نتائج بھی ہیں جو ہماری پہنچ سے باہر بھی نہیں ہیں ۔مختلف مذاہب کی تاریخ اور تاریخ ادیان کا تقابلی مطالعہ سماجیات (SOCIOLOGY) ، علوم آثار قدیمہ (ARCHAELOGY) ، علوم سیارگان (ANTHROPOLOGY) ، علم حیات (PALAEONTOLOGY) ، علم نفسیات (PSYCHOLOGY) نیز دیگر علوم کی مدد سے کئے جانے کی وجہ سے مذہب کا دائرۂ کار صرف وسیع نہیں ہوا ہے بلکہ مذہبی جبلی احساس کو اتنا بلند سمجھا جانے لگا ہے کہ اس کے ہر ہر جزو کی تشریح ضروری قرار دی ہے ۔

انسانی شعور، تحت الشعور اور انسان کے دماغی اور جذباتی عناصر کے عمل کی تفتیش کرنے میں فرائیڈ پہلا شخص تھا جس نے دوسروں کے لئے راہ کھولی ۔

پھر اڈلر اور جنگ بھی اسی طریقہ پر قائم رہے ۔ انہوں نے بھی انسانی ذہن اور جذبات کی گہرائی میں جھانک کر دیکھا اور بالکل ہی نئی

دنیا تلاش کرلی۔ انھیں اس دنیا میں صلاحیت، مختلف قسم کے ادراک، باطن نظری، واقفیت، نیت، غیب کی جانکاری، پسند اور قوتِ فیصلہ کا ایک عالم نظر آیا اور یہ ساری باتیں، بنیادی جبلی اور یقینی معلوم ہوئیں۔ انہوں نے دینی حِس کو بغیر ثانوی حیثیت دیئے ہوئے، اسی درجہ میں رکھا۔ اس میدان میں نئی سائینسی تحقیق کے لئے کئی دروازے کھول دیئے۔ اور اس معمہ کا حل پیش کر دیا۔

سائینس کی نئی ترقیوں نے تقریباً ہر مکتب فکر کے علما کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ مذہب کی جستجو انسانیت کی اصل ہے اور بشریت کے لئے لازمی، مقدم اور بنیادی عنصر ہے۔ اس کے بغیر انسان، انسان ہی نہیں ہے۔ دین کسی دوسری شئے سے بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ فطری علم کا گہوارہ اور باطنی نظر کی قیام گاہ ہے۔ اس کی جڑیں روح کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ یہ انسان کو خود اس کی معرفت بخشتی ہے، یہی حسِ دینی انسان کو اس کے وجود کا یقین دلاتی ہے۔

اسی معیار کے دوسرے جبلی شعور یہ ہیں:۔

(۱) **سچائی** : یہ حس حق و صداقت کے لئے مخفی خزانوں کی تلاش کی تحریک ہے۔ یہی انسان میں فکر کی محرک ہے۔ انسان میں یہ قوت اسی وقت سے ہے جب سے نوعِ انسانی کا وجود ہے۔ یہی قوت انسان سے مجہولات اور غیر معروف حقیقتوں سے متعلق لاتعداد مسائل کا مطالعہ اور ان کی تحقیق کراتی ہے۔ یہی شئے سائنس اور رانڈسٹری کو وجود میں لائی ہے۔ محققین اور علما نے سائینس کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں اور مخفی رازوں سے پردہ اٹھانے میں جو رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کی قوت

اسی جبلی قوت نے بخشی ہے۔ اسی نے انسان کو غیر مسخر علمی سلطنتوں کو کامیابی کے ساتھ فتح کرنے پر اکسایا ہے۔

(۲) **نیکی** : اس کی حس فضائل، فرائض، الہام، صداقت، عدل و محبت اور خلق کی فرودگاہ ہے۔ یہ جبلی تحریک انسان کو حق کی جانب مائل ہونے پر اکساتی ہے۔ اور باطل سے دور رہنے کی ہدایت کرتی ہے۔

(۳) **زیبائی** : لذت، ذوق، ہنر اور زینت کی حس جس میں خوبی اور حسن کی تمنا ہوتی ہے۔

ان تینوں صفات کیساتھ ایک اور شئے شامل کرنا ضروری ہے۔

(۴) **دینی حس** : انسان کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے ایک ایسے وجود کی کہ جس کی پرستش کی جاسکے۔ یہی حس مذکورہ تینوں انسانی شعور کی اساس اور بنیاد ہے۔ تصورِ الٰہی انسانی ضرورت ہے۔ خواہ یہ ضرورت عقلی ہو یا فطری، بہرحال انسانی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی کا حل ہے۔ عقل کو خدا کی ضرورت فکر و نظام کی راہ میں اور دینی حس کو خدا کی ضرورت محبت کی راہ میں ہوتی ہے۔ یہ حس خدا کے ساتھ لگاؤ یا رشتہ رکھنا چاہتی ہے۔

وجودِ خدا کی دلیل جیسا کہ ڈیکارٹس (DESCARTES) اور تھوماس اکیونس (THOMAS AQUINAS) نے فلسفیانہ انداز میں پیش کی ہے انسانی ذہن کے لئے بہت ہی موزوں اور پرکشش ہے۔ جدید سائنس اور فلسفہ کی نظر میں وہی دلیل اہم سمجھی جاتی ہے جو تجربات اور آزمائش کے ذریعہ پوری اترتی ہیں۔ صوفی منش مثل پاسکل (PASCAL) کے

دینی حس کی موافقت یا تائید، باطنی شواہد اور جبلی تحریک کی بنیاد پر ہی کرتے ہیں۔ پاسکل لکھتا ہے ۔"وجود باری تعالیٰ کی جتنی دلائل قلب انسانی میں ہیں وہ عقل کی پہونچ میں نہیں آتیں یا عقل کی دسترس ہی وہاں تک نہیں ہے۔"

وِل ڈورانٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے۔"دین ایک فطری شئے ہے جو براہ راست ہماری طبعی ضرورت اور احساسات سے پیدا ہوتی ہے۔" ڈاکٹر الیکسس کاریل (DR. ALEXIS CARREL) کہتا ہے "عرفانی حس ہماری بنیادی جبلت کی زبردست تحریک ہے۔ خدا انسان کی لازمی ضرورت ہے جس طرح کہ اس کو پانی کی ضرورت ہے۔"

سنہ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر روڈلف آٹو (DR. RUDOLF OTTO) نے تصدیق کی کہ عقل کے عناصر بالکل "فطرت" کے عناصر کے متوازی اور برابر رکھے گئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے شریک اور معاون قرار دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ (مدرک، قادر، یا حاکم علی الاطلاق ہوتا وغیرہ) کو خوب سمجھ لے۔ اللہ کے لئے "قادر" ہونے کا ایک الگ ہی مفہوم ہے کسی اور پر اس کا انطباق نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو انسانی صفات کے مانند گردانا یا مفہوم میں لانا صحیح نہیں ہے۔ خواہ وہ عقلی تفہیم ہو یا طبعی تصورات۔

لے RISE OF WISDOM IN EUROPE VOL.2 PAGE 18

ہم ایک ایسے دور میں ہیں جسے خلائی دور کہا جاتا ہے۔ ہم نے ارضی العاد ثلاثہ (THREE TERRES TRIAL DIMENSION) یعنی طول عرض اور گہرائی سے ہٹکر ایک چوتھی سمت باہری خلا (OUTER SPACE) کا اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح اس دور نے تین بنیادی حقایق راستی، نیکی اور زیبائی کے ساتھ انسانی روح کا تعلق ایک چوتھے تصور "الوہیت" کے ساتھ استوار کیا ہے۔ ممکن ہے یہی، ان تین العاد کی بنیاد ہو۔ یہ سچ ہے کہ ہر دور میں قلیل تعداد میں لوگوں نے مادیت کا پروپیگنڈہ کیا ہے۔ لیکن اس سے کسی طرح دینی حس کے فطری ہونے کی تردید نہیں ہوتی مادہ پرست دہریت ایک مختصر سی اقلیت کی خصوصیت ہے۔ نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت کو پورے طور پر ڈھانپ لینے والے قانون میں اس گروہ کی حیثیت علیحدگی پسند جیسی ہے۔ مابعد طبیعاتی نظریہ فطری ہیں۔ اور استثنا (EXEPTION) تو ہر قانون میں پایا جاتا ہے۔

انسانی تاریخ میں تشکیک پر مبنی پہلا مکتبۂ خیال ساتویں صدی (قبل مسیح) کے اواخر میں وجود میں آیا۔ اس مکتب کے راہبر تھیلس (۶۲۲ سے ۵۶۰ ق م) اور ہیرکلیٹس (۵۳۰ سے ۴۷۰ ق م) اور ان کے قریب ترین معاصر ڈیموکرائٹس تھے۔ ان سب میں مشہور ترین شخصیت اے۔ پی۔ کیورس کی تھی جو چوتھی صدی قبل مسیح کے وسطی دور میں تھا۔

پھر بھی ان مفکرین پر مکمل مادی نظریات منطبق نہیں کئے جا سکتے۔ اپنی کتاب "تاریخ فلسفہ (HISTORY OF PHYLOSOPHY)" میں ایک قابل سائنسدان

لکھا ہے: "تھیلس اقرار کرتا ہے کہ مادی تبدیلیاں، روحانی تحریک کے باعث ہوتی ہیں۔ نیز ڈیموکریٹس (DEMOCRITUS) مادیت پرست نہیں تھا بلکہ روحانیت کا معترف تھا۔"

دراصل سترہویں صدی عیسوی کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب مفکرین میں مادیت زور پکڑنے لگی۔ اگرچہ وہ خود اپنے افکار میں باہمی اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ مثال کے طور پر جیس جیکوس روسیو کو کچھ مصنفین نے مادہ پرست اور دہریہ اور کچھ نے خدا ترس بتایا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس نے "چرچ" پر خوب تنقید کی تھی اور شاید اسی وجہ سے اس کے مخالفین نے اسے دہریت کا ملزم قرار دے دیا ہو۔

مصری مصنف فرید وجدی نے اپنی کتاب دائرۃ المعارف میں روسو (ROUSSEAU) کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے جب ان مظاہر پر غور کیا جن سے فطری طاقتوں کی کارفرمائی ظاہر ہوتی ہے اور یہ چھان بین کی کہ کن طریقوں سے ایک سبب دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے، ایک نتیجہ کا ردِ عمل کیونکر دوسرے پر متبادل قوت کے ساتھ ہوتا ہے تو مجھ پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ اولین علت (سبب) یقیناً رحمٰن و رحیم ہی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسی کے ارادہ سے حرکت کا وجود ہے۔ اسی نے مردہ زمین یا وجود میں جان ڈالی ہے۔ آپ مجھ سے پوچھیں کہ وہ کہاں ہے؟ تو میں یہی کہوں گا کہ اس آسمان میں جسے اس نے گردش میں رکھا ہے، ان ستاروں میں جن کی روشنی کی چھاؤں میں ہم رہتے ہیں، خود مجھ میں یا اس بھیڑ میں جو چر رہی ہے یا اڑنے والے پرندوں میں یا اس

پتھر میں جو زمین پر پڑا ہوا ہے، درخت کے پتوں میں جنھیں ہوا کے جھونکے جھلا رہی ہے، ہوا میں جو ہر جگہ موجود ہے۔ گویا کہ وہ ہر شے میں ہے۔" (کیا یہ خیالات عقلی دلیل کے ساتھ نہیں ہیں؟ ہم ہر جگہ نظام ہی نظام دیکھتے ہیں کہ نہیں؟ کیا یہ اندھا اتفاق ہے؟ ایک حادثاتی ڈھیر ہے؟ دوسرے لوگ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں کریں۔ میں تو ہر شئے کو ایک مکمل نظام میں دیکھتا ہوں اور یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر نہیں رہتا کہ اس مکمل نظام پر ایک عظیم ترین دماغ کی کار فرمائی ہے۔ بے جان مادہ سے زندگی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ ایک "اندھا حادثہ" ایسے مظاہر کو جو پوری صحت کے ساتھ عمل کناں، ایک دوسرے سے مربوط، اور ایک دوسرے کے معاون ہیں، کیونکر جنم دے سکتا ہے؟ کیونکر ایک بے عقل عجوبہ ایسی ہستی کی تخلیق کر سکتا ہے جو ذہین اور بافہم ہے؟)

(۲۸)

خدا اور تجرباتی سائنس کے استدلال

عصر جدید کا انسان تجرباتی سائنس کے دلائل میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ ان تجرباتی سائنس یا علوم کی حدود اور سرحدوں پر غور کرنے کے لئے توقف بھی نہیں کرتا۔ یہ دماغی رجحان گمراہ کن بھی ہے اور تخریب کن بھی جبکہ خدا کے متعلق کوئی فکری مسئلہ زیر غور ہو۔ کسی موضوع پر انسان جتنی فکری جولانی کرتا ہے اور اسے اس موضوع پر جتنی دسترس حاصل ہوتی جاتی ہے، دوسرے موضوع اور مقاصد اس سے اتنا ہی چھوٹتے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی ساری توجہ ایک ہی نہج پر مرکوز رہتی ہے۔ لہذا انسان "الٰہیات" کو ثانوی مقام دیتے ہوئے سائنسی تحقیق سے باہر تصور کر لیتا ہے۔ اس رجحان کے سبب انسان تمام قسم کے مظاہر کو ایک ہی چشمہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔ تمام تجرباتی علوم کے ماہرین (اسپیشلسٹ) اپنی ساری ذہنی قوت کو ایک ہی موضوع پر مرکوز رکھتے ہیں اور دوسرے مفادات ان کے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ مافوق الحس وجود کے ساتھ فقدان تعارف اور دوری، ماورائے طبیعت حقیقت کو قبول کرنے میں سد راہ بن جاتی ہے۔ ان کے تجربات کی دنیا بھی مادی ہی ہوتی ہے۔ وہ ان کو مادی، اوزان اور پیمانے سے تولتے اور ناپتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی علوم کے انہیں شعبوں کو قبول کرتے ہیں جو ان کے پیمانے پر پورے اترتے ہیں، سائنس وہ علم ہے جو عالم ظہور میں

رونما ہونے والے واقعی حادثات کی وضاحت کرتی ہے۔ ان کے روابط پر تحقیق و تدقیق ہوتی ہے جو کائنات کا ایک جز ہیں جو انتہائی عظیم شئے سے لے کر انتہائی خفیف شئے تک کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن خدا اور دنیا کے درمیان کا ربط ان کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ مادی آلات سے مابعد طبیعات کی خبر لانے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ کسی تجربہ گاہ میں دیکھنے کی خاطر خدا کو خردبین کی سلائیڈ پر رکھا نہیں جاسکتا۔ کائنات کا خالق جو خلائی دور کے مادی مکان و زمان سے بلند ہے، قابلِ محسوس اشیاء کے پیمانوں میں محدود نہیں ہوسکتا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک مخصوص دوا اور ایک جسم یا صحت کے کیمیاوی معمول کے درمیان ایک ربط ہوتا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر سے پوچھئے کہ دوا کس طرح عمل کرتی ہے تو جواب میں وہ تکنیکی زبان کے بجائے اسی زبان کا استعمال کریگا جو آپ کے علمی معیار کے لئے مناسب ہو۔ کسی طبی مسئلہ کے جواب میں یہ کہدینا کہ خدا ہی جانے، ایک غیر سائنسی اور جاہلانہ بات ہوگی، کیونکہ طبی مسئلہ کا جواب بھی طبی ہونا چاہئے۔ ہر علم کے لئے اس کے اپنے ماحول کی گفتگو میں ضروری ہے کہ اسی علم کی تکنیکی زبان کا استعمال ہو۔ "الٰہیات" بھی گفت و شنید کی اپنی الگ دنیا رکھتی ہے اور اس کی بھی خاص اصطلاحیں ہیں۔ کیونکہ اس علم کی بھی ایک انفرادیت ہے۔ تمام ماہرین اپنے دائرہ کار کو کسی ایک ہی شعبہ میں محصور رکھتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص زاویۂ فکر کے ساتھ کسی خاص شعبہ میں حاصل کی جانے والی تعلیم تحت الشعور میں خدا کے متعلق تشکیک قائم کردیتی ہے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے ارادۃً اپنے مطالعہ اور

تجربات کو کسی علم کے ایک شعبہ سے ملحق کر رکھا ہے اور وہ اسی میں گویا اسیر سے ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ تجرباتی سائنس کے نتائج بھی مادی ہی ہوتے ہیں۔ جن کا استعمال روزمرہ کی زندگی میں کیا جاتا ہے۔ ان کو استعمال کرنے والے لوگوں کو یہ نتائج حقیقی اور قریبی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بلیغ تخیّلات کے متعلق حد درجہ مشکوک ہوتے ہیں کیونکہ ان بلند خیالات کا تعلق معمولاتِ زندگی میں فوراً ظاہر نہیں ہوتا۔ تقریباً تمام شعبہائے سائنس کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے چاروں طرف ناقابلِ عبور چہار دیواری ہے، یہ چہار دیواری خود انہوں نے قائم کی ہے اور خود کو اسی میں محصور کئے ہوئے ہیں۔ اس چہار دیواری کے اندر رہ کر مقررہ اصولوں کے تحت حاصل کئے جانے والے نتیجوں پر دنیا کا اعتبار بڑھا ہے اور اسکو عوام میں مقبولیت اور اعتماد حاصل ہوا ہے۔ یہ رجحان، سائنس نے اپنے مفاد کی خاطر ہمارے ذہنوں میں پیدا کیا ہے جو ہمارے دل و دماغ پر محسوس وغیر محسوس دونوں طریقے سے مسلط کی گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے تمام اثرات معدوم ہوتے گئے۔

جب تک کوئی شخص عقیدہ میں راسخ اور مستحکم نہیں ہوتا وہ عارفین الٰہی کی راہوں سے بیگانہ ہی رہتا ہے۔ اس کی تشکیک میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ اسی شئے کو قابلِ قبول تصور کرتا ہے جو زندگی میں سائنٹفک خیالات اور رجحانات کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے ہر اس شئے کو غیر مقبول قرار

دیتا ہے جسے سائنس نے پایۂ ثبوت تک نہیں پہونچایا یا اس کے لئے ثبوت بہم پہونچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہر اس مسئلہ کو ناقابل توجہ سمجھتا ہے جس کا تعلق یا لگاؤ مذہب یا عقیدہ سے ہوتا ہے۔ جبتک وہ کسی شئے کو اس کی ظاہری صورت میں پرکھ کر نہیں دیکھتا اور تجربات کے ذریعہ ثابت نہیں کرلیتا وہ اس شئے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ مذہبی اقدار کو سائنٹفک زبان اور فارمولوں کے تحت بے وزن اور معمولی قرار دیتا ہے۔ اس طرح مذہبی فکر کی بنیاد بے توجہی کا شکار ہوگئی ہے۔

یہ بہت بڑی بھول ہے سائنس اپنے مشاہدات کو دقیق اور پیچیدہ فارمولوں میں بیان تو کرسکتا ہے لیکن وہی فارمولے اور خیال جب ایک بار معمولات زندگی میں لائے جاتے ہیں اور جب ان کا ترجمہ عام روزمرہ کی زبان میں ہوتا ہے تو وہ بہت ہی بے وزن اور معمولی بن جاتے ہیں۔

میڈیکل سائنس کسی طبی معائنہ میں ہوسکتا ہے کہ بہت احتیاط سے کام لے۔ عمل کے دوران بہت ہی ٹکنیکی بات کے اظہار میں کوئی ڈاکٹر دقیق زبان کا استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن وہی بات جب کسی مریض سے کہنے کا موقع آتا ہے تو بہت ہی آسان زبان میں کہتا ہے۔ فلاں دوا کھاؤ، غذا میں فلاں شئے سے پرہیز کرو۔ اتنے دنوں تک آرام کرو وغیرہ وہ ذی علم ڈاکٹر مریض سے بنیادی فارمولوں کو نہیں بتاتا۔ دوا کے عمل کے متعلق بھی نہیں بتاتا۔ وہ تو صرف علاج کے سلسلہ میں ضروری باتوں کی ہدایت دے دیتا ہے۔

اسی طرح آج کے دور میں ٹیلفون اور ریڈیو روزمرہ کی ضرورت ہیں۔

ان کو معمولی آدمی بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ان کے مصرف کے بہترین طور طریقوں کے متعلق استعمال کرنے والوں کو، آسان اور صاف ستھری زبان میں ہدایتیں دی جاتی ہیں۔ اور تمام دقیق اور تکنیکی لفظوں سے احتراز کیا جاتا ہے۔ تکنیکی زبان اور لفظ کا استعمال وہیں کیا جاتا ہے جہاں یہ چیزیں بنائی جاتی ہیں یا اس تکنیک کی کتابوں میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔

لہٰذا دین کی باتوں کو معمولی اور اپنے مفادات سے باہر صرف اس بناء پر سمجھنا کہ ان کا اظہار دقیق فارمولوں اور سائینسی زبان میں نہیں ہے، ناانصافی اور غیر منطقی ہے۔ حقیقتاً یہ مذہب کی کامیابی ہی ہے کہ اس کے اصول وقواعد بالکل سادہ اور آسان زبان میں بیان ہو جاتے ہیں جسے عام لوگ بھی سمجھ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ، اگر مذہب کے اصول و قواعد انسانی تحقیقات اور فارمولوں کے اندر ہوتے تو پیغمبروں اور نبیوں کو بھیجنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہم انہیں خود ہی بنا لیتے یا تیار کر لیتے۔ جس طرح سائنس دان اور صنعت گر مل کر مشین تیار کر لیتے ہیں۔

اب تک انسان اس قابل نہیں ہو سکا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ زمین کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا ہے اور اس نے ان پر دسترس پالی ہے یا وہ ان ساری باتوں سے واقف ہو چکا ہے جن سے واقف ہونا تھا۔ انسان اب تک گتھیوں کو سلجھا ہی رہا ہے۔ اسے بار بار اپنی غلطیوں کی تصحیح بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے سامنے اب بھی بہتیرے حقائق ہیں

جو اس کے علم میں نہیں آئے ہیں۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اسے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔
اب ہمیں چاہئے کہ ہم سائنس کے میدان کی سرحدوں کو دیکھیں اور ان مسائل کو بھی جن کے اظہار کا حق سائنس کو پہونچتا ہے اور جن کے متعلق سائنس کو اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ کیا سائنس کا دائرہ عمل و تحقیق ایک حد تک محدود ہے؟

وہ موضوع کہ جس کا مطالعہ کرنا یا جس پر غور کرنا تجرباتی سائنس کے لئے ضروری ہے، مادی دنیا اور مادی مظاہر میں سے ہے۔ تکمیل مقصد کے لئے جو بھی سائنسی آلات اور نتائج حاصل کرنے کے پیمانے "مشاہدات"، "مفروضات" اور "تجربات" اپنے کنٹرول کیساتھ محض ثبوت پر مشتمل ہیں۔ سائنس داں دنیا اور اس کی چیزوں پر عمل کیا کرتے ہیں، خواہ وہ چیزیں بہت بڑی ہوں یا انتہائی چھوٹی۔ اگر ان کی دریافت اور باہری دنیا کے درمیان موافقت ہوتی ہے تو اسے قبول کرتے ہیں۔ اور اگر یہ دریافت مشاہدات کے خلاف ہوتی ہے تو اس کو مسترد کر دیتے ہیں۔ آزمائش کے ذریعہ اپنی دریافت پر یقین حاصل کرنے کے لئے اطراف کی دنیا کے ساتھ موافقت کا ثبوت حاصل کرتے ہیں۔

کوئی سائنسی تحقیق ایسی نہیں کہ جو ایمان و عقیدہ پر اپنی دسترس کا دعوی کر سکے۔ تجرباتی سائنس کس نقطہ پر خدا سے رابطہ قائم کر سکتی ہے؟

درحقیقت کسی شخص کے ایمان و عدم ایمان کے متعلق تجرباتی علوم کچھ بھی کہنے سے عاجز ہیں۔ چونکہ علوم طبعی کا دائرہ صرف طبعی مظاہر تک

محدود ہے لہٰذا سائنس دان خدا کے متعلق کوئی مثبت یا منفی اظہارِ خیال نہیں کر سکتے۔ تمام مکاتب مذاہب کم سے کم اہل کتاب کے نزدیک خدا کوئی جسمانی وجود نہیں ہے۔ حواسِ خمسہ خدا کا ادراک نہیں کر سکتے اس لئے کہ اس کے ساتھ مکان و زمان کی قید نہیں ہے۔

اس کی صفت یہ ہے کہ وہ کمالِ کل ہے، اپنی ذات سے الگ کسی شئے کا محتاج نہیں۔ تجرباتی سائنس کی تمام کتابیں پڑھ جایئے کہیں بھی یہ بات نہیں ملے گی کہ تجربات کے ذریعے خدا یا اس کی صفات کو پرکھا جا سکتا ہے ظاہر ہے کہ خدا کوئی طبعی مظہر ہے نہیں۔ لہٰذا کوئی تجربہ خدا کے متعلق کسی مفروضہ کو تحقیق میں لا نہیں سکتا۔ کوئی تجرباتی سائنس دان اپنی تحقیق کی بناء پر اگر خدا سے انکار کرتا ہے تو اس کا صریحی مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے علم کی ڈگر چھوڑ دی بلکہ اس نے سائنس کے اصول کو توڑ ڈالا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے وہ خود اپنے موضوع اور پیشہ کے متعلق بھی واقفیت نہیں رکھتا علومِ سائنس الٰہیات کے الف۔ ب سے بھی لگاؤ نہیں رکھتے۔ کسی بھی شخص کے لئے یہ بات قطعی غیر منطقی ہے کہ وہ خدا کے وجود سے انکار کرنے کے لئے تجرباتی علوم میں غوطے لگائے۔

جارج لسٹر (GEORGE LISTER) اپنی کتاب "مقدماتِ[1] اصولِ فلسفہ" میں کہتا ہے: "ایسی شئے کا تصوّر ناممکن ہے جو مکان و زمان اور تغیر و ترمیم سے قطعاً آزاد ہو۔" ایسا بیان ایک ایسی ذہنیت کی عکاسی

---

[1] "INTRODUCTION TO PHILOSOPHICAL PRINCIPLES"

کرتا ہے جس کی بنیاد طبیعی اور قابلِ محسوس اشیاء کے پائے پر ہے۔ ایسی ذہنیت اپنے عمل و حس کی حدود سے باہر کی شے کو ناممکن تصور کرنے پر مجبور ہے۔ ایک انصاف پسند طبعی سائنس دان یہی کہہ سکتا ہے کہ "مابعد طبیعات میری گفتگو سے باہر ہے لہذا میں اس کے متعلق خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ میں نہ تو تصدیق کر سکتا ہوں اور نہ تکذیب۔" وہ کسی ایسی شے کے لئے کوشاں ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا جو اس کے دائرہ عمل سے باہر ہے ایک شخص، جو خود کو محسوسات کے دائرے میں اسیر کئے ہوئے ہے۔ اس کے تجربات کی دنیا قابل محسوس وجودات تک محدود ہے۔ ابھی وہ ان حقیقتوں سے انکار نہیں کر سکتا جو اس کے عالم احساس سے باہر ہیں۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو اسے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انکار اس کا اپنا ذاتی خیال ہے تحقیق، تجربہ اور سائنسی ثبوت کا نتیجہ نہیں ہے۔

اہل یقین یا خداترس افراد کا خدا ویسا نہیں ہے جیسا خدا سائنس دان چاہتے ہیں کہ جس کی شناخت اور جس کا وجود طبعی علت و معلول کے لحاظ سے قائم ہو۔ ایسا وجود ہرگز خدا نہیں ہو سکتا۔

اَن دیکھے وجود کا عقیدہ صرف خدا ہی تک نہیں ہے

خدائے یکتا کہ جس کی شناخت پیغمبروں اور اوتاروں نے بہم کی ہے وہ مطلق العنان حاکم، ازلی اور ابدی ہے۔ ہر مقام اور ہر جگہ موجود ہے پھر بھی کسی مقام کا نہیں ہے، نامحسوس ہے صرف آنکھوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام اعضائے حواس کیلئے

ذہنِ انسانی نے فطری طور پر یہ یقین کر لیا ہے کہ تمام حواس سے بعید ایک ایسا وجود ہے جو تمام مادوں سے بلند، مادی ظہور سے پرے اور سائنسی تجربات کی پہونچ سے باہر ہے۔ لوگوں کا طریقہ فکر یہی ہے کہ جس شئے کے تصور کو مشکل پاتے ہیں اسے بآسانی موردِ انکار قرار دیدیا کرتے ہیں۔ ملحدین اور بے دین سوال کرتے ہیں کہ اگر خدا موجود ہے تو پھر خود کو ظاہر کیوں نہیں کرتا؟

تمام علوم (سائنس) کا اصول یہی ہے کہ جب وہ کسی حقیقت کو دریافت نہیں کر پاتے اور اس کی تصدیق اپنے فارمولوں یا پیمانوں سے نہیں کر پاتے تو وہ اس کی موجودگی کا اقرار کرتے ہیں نہ انکار اس کے عدم کا ثبوت پیش نہیں کرتے "تاوقتیکہ کوئی تجربہ یا ترکیب ڈھونڈ نہ لیں جب تک کوئی سند اپنے خیال کے لئے نہ پالیں کسی حقیقت کے معدوم یا محال ہونے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ سائنس دانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے خیال کی تائید اپنے علم میں جب تک نہ دیکھیں اس وقت تک اپنے خیالات ظرف انتظار میں محفوظ رکھیں۔

تمام وجودات جنھیں ہم قبول کرتے ہیں یا جن کے وجود کا تعین ہمیں ہے کیا ان سب کا وجود، مثلاً خود ہمارا وجود کیا ہماری علمیت کا ممنون ہے یا اس کا ادراک ہم کر سکتے ہیں؟ کیا خدا کے موجود نہ ہونے کا ثبوت یہی ہے کہ وہ طبعاً محسوس نہیں ہوتا؟ کیا وجود خدا سے انکار ہم اس بنیاد پر کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے دائرۂ محسوسات سے خارج ہے۔ ہم حسی طور پر اس شے کی صفات کا درک نہیں کر پاتے؟ تمام مادیت نوازوں کو یہ معلوم ہے کہ ہماری (مسلّم) معلومات و تعلیمات کا اچھا خاصا حصہ قضاؤ قدر سے وابستہ ہے اور ایسے حقائق پر مبنی ہے جو غیر محسوس اور غیر مانوس ہیں۔ صفحۂ وجود پر بے شمار ناقابلِ دید موجودات ہیں۔ جدید سائنس اور علوم کی پیش رفت نے لاتعداد حقائق ایسے دریافت کئے ہیں جن میں خفیف ترین موجودات کی خبریں ملتی ہیں۔

آج کل سائنس داں حضرات کو ایک مسئلہ نے الجھا رکھا ہے۔ وہ ہے کیت کو توانائی اور توانائی کو کیت میں بدلنے کا مسئلہ۔ تمام قابلِ دید اجسام ایک دوسرے کے لئے توانائی کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں اور اس سے ان کی خارجی شکل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے مثلاً لکڑی کا جلنا ہے۔ یہاں بھی انرجی کا تبادلہ ہے۔ لیکن، یہی انرجی، جو نظام ہستی میں بہت بڑی فعالیت اور اس کے نتیجہ کی ذمہ دار ہے، چھوکر یا دیکھ کر اندازہ میں نہیں لائی جا سکتی۔

برق (بجلی)، سائنسی تعمیرات اور معمولات زندگی میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن سائنس دان یا کسی دوسرے ماہر نے بجلی کو استعمال کرتے وقت یا اور کسی وقت خود بجلی کو دیکھا ہے؟ کیا کسی نے بھی بجلی کا ادراک

یا احساس وزن، ساخت اور اس کی بناوٹ سے کیا ہے؟ لیمپ کے روشن ہونے یا دوسرے اثرات کو دیکھ کر ہم نے سمجھا ہے کہ بجلی عمل کر رہی ہے۔

اسحٰق نیوٹن (ISAAC NEWTON) کی تحقیقات سے پہلے کسی کو اجسام کی باہم دگر کشش کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ اسی شئے کو نیوٹن نے کشش ارضی کے قانون کے تحت بتایا ہے۔ یہ کشش ارضی دیکھی، سنی یا سونگھی نہیں جا سکتی اور نہ ہی محسوسات میں مقید کی جا سکتی ہے۔ نیوٹن کے بعد یہی قانون کشش سائنس کی دنیا میں ایک بنیادی تصور کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ہماری تمام جدید انڈسٹریز اس کا استعمال کرتی ہیں۔ لیکن خود نیوٹن نے بھی اس طاقت کو کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ خود نیوٹن ہی نے اس کا اندازہ بڑی ہی صلاحیت کے ساتھ لگایا تھا۔ یہ تو ایک سیب کے درخت سے ٹوٹ کر گرنے کا منظر تھا جس نے اس حقیقت کی جانب نیوٹن کی توجہ مبذول کر لی تھی۔

علم طبعیات والے (PHYSICISTS) اسپکٹرواسکوپی (SPECTROSCOPY) کا بہت استعمال کرتے ہیں۔ وہ اسپکٹرم[1] کے رنگوں کا حساب کرتے ہیں جس میں سب سے نیچے (تہ میں) سرخ رنگ اور سب سے اوپر بنفشی رنگ ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی باخبر ہوتے ہیں کہ روشنی کے ان دونوں رنگ بنفشی اور سرخ کے مابین بے شمار رنگ ہوتے ہیں جو سب کے سب ہمارے مشاہدہ میں نہیں آتے۔ ان کا قول ہے کہ لہروں کے طول کے ساتھ رنگ میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور لہروں کے طول ہی روشنی کی لہریں

---

[1] ایک رنگین پٹی جس پر روشنی کی شعاع الگ الگ رنگوں میں کی جاتی ہے۔

کہلاتی ہیں۔ آفتاب یا کسی اور شئے کی روشنی میں تمام رنگوں کا اجتماعی تناسب ٹھیک اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کسی ایک شعاع میں۔ اور سفید لہر کے متعلق خاص طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اجتماعی طور پر ہماری آنکھ سے ٹکراتی ہے۔ جب یہ شعاعیں کسی شئے سے ٹکراتی ہیں تو وہ شئے شعاعوں کے ایک مخصوص حصہ کو جذب کر لیتی ہے اور باقی کو منعکس کر دیتی ہے۔ ہم انہیں منعکس شعاعوں کو دیکھتے ہیں اور انہیں کے ذریعہ ہم کسی چیز (OBJECT) کو دیکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ لہروں کی طاقت اور کمزوری سے بھی رنگوں میں تبدیلی ہوا کرتی ہے یا فرق آتا رہتا ہے۔ اگر لہروں کی طاقت ۴۵۷,۰۰۰ ملیارڈ فی سکنڈ ہوتی ہے تو روشنی سرخ پٹی پر متحرک ہوتی ہے جب یہ طاقت ۷۲۷,۰۰۰ (سات سو ستائیس ہزار) فی سکنڈ ہوتی ہے تو روشنی بنفشی پٹی پر ہوتی ہے۔ جبکہ ان میں بے شمار ہلکے اور گہرے رنگ ایسے ہوتے ہیں جو ان اعداد و شمار سے کہیں کم یا زیادہ ہوتے ہیں جو انسانی حواس میں بھی نہیں آتے۔

ہوا جو ہمارے چاروں طرف موجود ہے، غیر معمولی وزن رکھتی ہے۔ ایک مطالعہ کے تحت ہمارے جسم پر اس کے دباؤ کا وزن ۱۶۰۰۰ (سولہ ہزار) کیلوگرام ہے۔ چونکہ ہمارے جسم کے ہر حصہ پر باہر اور اندر سے اس کا دباؤ یکساں ہوتا ہے اس لئے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ گیلیلیو گیلیلی "GALILEO GALILEI" (۱۵۶۴ سے ۱۶۴۲ء) اور بلائز پاسکل (BLAISE PASCAL)

(۱۶۲۳ سے ۱۶۶۲ء) کے قبل تک یہ سائنسی حقیقت ہمارے علم میں نہ تھی۔ اور نہ ہی یہ حقیقت انسانی حواس کے ذریعہ شناخت میں آئی۔ ہوا کے متعلق چند مظاہر مثلاً بلندی کے اعتبار سے اس کے دباؤ میں فرق پیدا ہونا۔ ایسے ہی مظاہر ہیں جس نے ہمارے مفکرین کو ہوا کے دباؤ اور وزن کا مفروضہ قائم کرنے پر اکسایا پھر انہوں نے آزمائشوں اور تجربات کے ذریعہ اس کو ثابت کر دکھایا[1]

---

[1] ہمارے امام چہارم حضرت زین العابدین علیہ السلام نے اپنی دعاؤں کے مجموعہ کے دوسرے جز کی ۵۵ ویں دعا کے مقفیٰ ٹکڑوں میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

- "پاک و منزہ ہے تیری ذات، تو ہمارا خالق اور رب ہے۔ تو آسمانوں (Heavens) کے وزن کو جانتا ہے۔
- پاک منزہ ہے تیری ذات تو ہمارا خالق اور رب ہے تو تمام دنیاؤں کے وزن کو جانتا ہے۔
- پاک و منزہ ہے تیری ذات، تو ہمارا خالق اور رب ہے تو آفتاب و ماہتاب کے وزن کو جانتا ہے۔
- پاک و منزہ ہے تیری ذات، تو ہمارا خالق اور رب ہے، تو اجالے اور اندھیرے کے وزن کو جانتا ہے۔
- پاک و منزہ ہے تیری ذات، تو ہمارا خالق اور رب ہے، تو ہوا اور سائے کے وزن کو جانتا ہے۔"

(اس دعا میں آج بھی ایک دعوت فکر موجود ہے کہ انسان اپنے سائے کا وزن دریافت کرے۔ "مترجم")

سائنس دان حضرات نے اگرچہ قابل محسوس اشیاء پر بہت تجربات کئے ہیں اور ان تجربات سے یا ان کے استدلال سے بہت سے نتائج اخذ کئے ہیں، فطرت کی بہترین خصوصیات معلوم کی ہیں، پھر بھی اکثر ان میں سے ہمارے حواس میں براہِ راست نہیں آسکتیں، مثلاً ریڈیائی لہریں ہر سمت ہمہ دم متحرک رہتی ہیں لیکن مشاہدہ میں نہیں آتیں۔ قوت جذب و کشش سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ لیکن یہ قوت غیر مادی ہی گنی جاتی ہے اور اس کے ذرّات بھی نہیں پائے جاتے کہ جنھیں پیمائش کے لئے پیمانوں پر رکھا جاسکے۔

ناقابل دید طاقتوں، ان کے اثرات اور ان کے وجود و عمل کے داخلی قانون کے مطالعہ میں سائنس کی کاوش قابل ستائش ہے اور اس میں اُنکی فتح مضمر ہے۔

علم ارضیات نے زمین کے غلاف کی پرتوں کی ساخت دریافت کی۔ پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اس علم نے ہمیں بتایا کہ طبقات ارض کی بناوٹ کیونکر ہوئی، کس رفتار سے بناوٹ کی ترتیب میں لاکھوں برس کا عرصہ لگا۔ اس کے بند اور پرتوں کی کیونکر تشکیل ہوئی۔ سمندر کیونکر عالم وجود میں آئے اور کس طرح اس نے وسعت اختیار کی، پہاڑوں کے سلسلے کیونکر قائم ہوئے۔ سطح ارض کس طرح قائم ہوئی۔ کس اصول کے تحت یہ اپنے محور پر گردش کررہی ہے۔ یہ ساری اطلاعات موجودہ دور کے علمی زور کی بناء پر فراہم ہوئیں۔ لیکن آج کا کوئی بھی انسان اس وقت موجود نہ تھا جو ان واقعات کو دیکھتا جن کے متعلق اتنے اعتماد کے ساتھ ہمیں اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔ ان تمام

حقائق کو ہم بغیر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے ہوئے یقین کر لیتے ہیں۔

مابعد الطبیعاتی وجودات میں عدالت، حسن، محبت، نفرت، عداوت اور خود عقل بھی شامل ہے۔ یہ تمام وجودات محسوسات سے درک کئے جا سکتے ہیں نہ ان کی حد مقرر کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم انہیں حقائق ہی میں شمار کرتے ہیں۔ آدمی اپنے علم کی استعداد کا شعور رکھتا ہے۔ اسے اس بات کا بھی شعور ہے کہ وہ کس حد تک کسی چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے حواس کے پرے بھی حقائق ہیں اور وہ ان کا درک حواس کی مدد سے نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی ذات میں خود اپنا شعور تو رکھتا ہے۔ لیکن دوسرا شخص اس کی ذات سے واقف نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف حرکتوں کے مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک قوت ارادی ہے جو حرکت پر مائل کرتی ہے۔

کیا ان اسباب کا ناقابلِ محسوس ہونا اور ان کی خصوصیات کا ناقابل تفتیش ہونا خود ان کے وجود کے انکار پر دال ہو سکتا ہے؟ ملحدین کا تصور ہے کہ وجودِ خدا کے لئے جسم و مکان و زمان بھی ضروری ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کے بھی ہماری ہی طرح پسلیوں کا ڈھانچہ ہونا چاہیئے ورنہ اس کا وجود ناقابلِ قبول ہے۔ یہ تصوّرات بت پرستوں کے ہیں جو بت خانوں میں بت سجاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ دماغ و عقل کے اندھے ہوتے ہیں وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ اگر خدا موجود ہے تو اسے بالکل ہمارے ہی جیسا ہونا چاہیئے اور اسے بھی قابل دید ہونا چاہیئے۔ چونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حواس کا ادراک قطعی، صحیح اور یقینی ہے۔ لہذا وہ خود کو حواس کی چہار دیواری میں

محصور کر لیتے ہیں اور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ سائنس اور فلسفہ کے مسائل صرف حواس کے درک پر حل نہیں ہو سکتے۔ ایسا خیال گمراہ کن ہوتا ہے۔ تمام حقائق حواس کے ذریعہ معرضِ شعور میں نہیں لائے جا سکتے۔ وہی آنکھیں، جن کے ذریعہ ہم حقیقتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، دوسری حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت سے قطعی عاری ہیں۔ حواس کی غلطیوں کے متعلق علم نفسیات نے کافی مواد اکٹھا کیا ہے۔ ان غلطیوں سے فائدہ بھی اٹھایا گیا ہے۔ ایک کالیڈوسکوپ (KALEIDOSCOPE) میں بہتری تبدیلیوں کے ساتھ متحرک تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں کوئی تصویر اپنی الگ حقیقت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ سب فریب نظر کا نتیجہ ہیں سینما کی فلموں میں ایک ہی مسلسل تصویر نہیں ہوتی۔ تصویر الگ الگ ہوتی ہیں لیکن آنکھیں الگ الگ تصویروں کو الگ الگ خاکوں میں نہیں دیکھ پاتیں بلکہ کل تصاویر یوں نظر آتی ہیں جیسے کہ وہ ایک ہی تصویر ہے اور مسلسل حرکت کر رہی ہے۔

حواسِ لامسہ کی تشخیص اور اس کا فریب ایک معمولی تجربہ سے ثابت ہو سکتا ہے۔ تین بڑے ظروف میں بالکل مختلف درجۂ حرارت کا پانی بھر دیا جائے۔ پہلے ظرف میں پانی کا درجۂ حرارت پانی کو ابالنے کے قریب، دوسرے ظرف کا پانی تقریبًا منجمد ہونے تک ٹھنڈا اور تیسرے ظرف کا پانی کمرہ کے درجہ حرارت تک گرم ہو۔ پھر ایک ہاتھ تقریبًا ابلتے ہوئے پانی میں اور اسی وقت دوسرا ہاتھ سرد پانی میں رکھا جائے۔ تھوڑی

دیر تک دونوں ہاتھ دونوں ظروف میں رہیں۔ پھر دونوں ہاتھ گرم و سرد پانی سے کھینچ لئے جائیں اور کمرہ کے درجۂ حرارت والے پانی میں ڈالے جائیں۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ دو مخالف احساس ایک ہی مقام پر بیک وقت ابھریں گے۔ دونوں ہاتھ دو قطعی مختلف اطلاعات دیں گے۔ جو ہاتھ پہلے انتہائی سرد پانی میں تھا آپ کو یہ بتائے گا کہ کمرہ کے درجۂ حرارت والا پانی کافی گرم ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا ہاتھ یہ خبر دے گا کہ وہی پانی انتہائی سرد ہے۔

جو اطلاع ہاتھوں کے ذریعہ دماغ تک پہونچی ہے۔ اس کی تردید عقل بھی کرتی ہے۔ ایک ظرف کے پانی کا درجۂ حرارت ایک ہی ہو سکتا ہے اجتماع ضدین محال عقلی ہے۔ لیکن ہاتھوں کی اطلاعات کا انحصار گذشتہ کیفیتوں پر ہے۔ انسانی عقل ان دونوں خبروں کو برطرف کر دیتی ہے۔ اس کا فیصلہ مختلف ہوتا ہے۔

عقل انسانی حواس کی گواہیوں پر صدور فیصلہ کا اختیار قطعی رکھتی ہے۔ حواسِ خمسہ کی اطلاعات کی کوئی حقیقی اور صریحی قیمت نہیں ہوتی صرف تجربات کی دنیا میں اہمیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ پورے طور پر حواس کی فراہم کردہ خبروں پر انحصار کرتے ہیں وہ کبھی مسائل ہستی اور تخلیق کے معموں کا حل ڈھونڈھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیل فلاماریون (CAMILLE FLAMMARION) مشہور محقق اپنی کتاب

"اسرارِ مرگ" میں لکھتا ہے : " انسان وادیٔ جہل و نادانی میں زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اس بات سے بے خبر ہے کہ انسان کے اجزائے ترکیبی کسی کی رہنمائی حقیقت کی جانب نہیں کر سکتے۔ حواسِ خمسہ ہر مقام پر اس کو فریب دیتے ہیں۔ حقائق تک انسان کی رہبری صرف عقل، فکر اور قوتِ فیصلہ سے ہی ممکن ہے۔"

جدید سائنس اور منطق سے یہ بات متحقق ہے کہ مالیکولس (MOLECULES)، ایٹم (ATOMS) اور ایسی ہی دوسری طاقتیں موجود تو ہیں لیکن ہم انہیں دیکھنے سے قاصر ہیں، ہم حواسِ خمسہ کے ذریعہ محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی اقرار نے ایک طرف تو کائنات کے دریچے کھول دئے ہیں کہ انسان ان کے راز ہائے دروں پر غور و خوض کر سکے۔ دوسری طرف یہ خبر بھی فراہم کی ہے کہ ایسے موجودات بھی ہیں جو ہماری پہونچ کے باہر ہیں۔ اگرچہ ہم ایسے موجودات کا انکار نہیں کر سکتے جو محسوس نہیں ہو پاتے۔ یعنی کسی شئے کے وجود کو محسوس کر لینے میں حواس کی ناکامی اس شئے کے عدمِ وجود کی منطقی دلیل نہیں بن سکتی۔ ہمارے خارجی حواس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ہر موجود کا ادراک کر لے۔ بلکہ حواس سے کبھی کبھی دھوکا بھی ہوا ہے اور اصل حقیقت کے خلاف اطلاع بھی ہمیں ملی ہے۔ ہمیں بالکل یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ تمام موجودات ہمارے حواس کی حدود میں اسیر ہیں۔ ہمیں ان امکانات سے باخبر ہونا چاہیے کہ ایسے موجودات بھی ہیں جن کا ادراک ہمیں حواس کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بیکٹیریا (میکرب)

کی دریافت کے قبل کسی شخص کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ خود اس کے جسم اور جسم کے چاروں طرف لاکھوں میکرب پراگندہ ہیں۔ یا یہ کہ آدمی کی زندگی مخالف اور موافق بیکٹیریا کے لئے میدان جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی لئے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہمارے حواس خارجی میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ہمیں حقیقتوں تک پہونچا سکے اور ہم پر حقیقتِ وجود کو عیاں کر سکے۔ یہ تو ہماری عقل و فکر ہے جو ہم سے ہماری کائنات کی ساخت کا کامل طور پر صحیح صحیح تعارف کرا سکتی ہے۔

مادیت کے پھیلاؤ کے اسباب

ماحصل یہ ہے کہ انسانی دینی رجحان کو کوئی آواز روک نہیں سکتی۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ فطرتاً انسان میں دین کی رغبت موجود ہوتی ہے۔ عقل و روح کی روشنی میں انسانی فطرت "وحدانیت" اور خالق کے احترام کی جانب ایک جبلی کشش رکھتی ہے۔

اس کے برخلاف مادہ پرستی فطرت کی جبلی حس کو قبول نہیں کرتی "انسان میں مذہبی حس کیونکر پیدا ہوئی؟" اس سوال میں اپنا وقت ضایع کرنے کے بجائے سائنس کو یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ آدمی میں مادیت پرستی کے رجحانات پیدا ہونے کے اسباب و عوامل کیا تھے؟ اس تصوّر کا وجود کیسے ہوا؟

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے عقائد کی نمود براہ راست اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی سائنسی پیش رفت سے ہوئی۔ وہ یہ بھول گئے کہ قدیم ترین زمانے سے، ہر دور میں تمام طبقہ کے افراد نے مادیت کے نظریہ کو ٹھکرایا ہے وہ طبقہ خواہ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، مہذب ہو یا وحشی، زیرک ہو یا بیوقوف۔ آج کے دور میں بھی جس کو "سائنسی دور" کہا جاتا ہے، ہر طبقہ اور سوسائٹی میں کچھ افراد باصلاحیت ہوں یا بے صلاحیت مابعد طبیعاتی خیال رکھتے ہیں اور وجود خدا کے قائل ہیں۔

اگر مادیت کا دعویٰ صحیح ہوتا تو عصرِ حاضر میں جو شخص جتنا زیادہ تعلیم یافتہ ہوتا اتنا ہی بڑا ملحد ہوتا۔ لیکن حقیقت اس کے قطعی خلاف ہے۔ عظیم دانشمندوں میں سے اکثر انتہائی درجہ خدا ترس اور موحد ہیں۔

یہ ایک بے بنیاد اور غیر سائنسی اور احمقانہ نعرہ ہے کہ " سائنس آموجود ہوئی خدا مر گیا۔" (SCIENCE HAS COME / GOD IS DEAD")
اس میں آدھی بات سچ ہے کہ ہمارے دور میں بہت سے کائنات کے راز منکشف ہوئے ہیں اور حقائق سامنے آئے ہیں لیکن اس میں یہ بات بالکل جھوٹ پر مبنی ہے کہ: "جہالت اور خوف کے ارتباط کے سبب 'ایمان باللہ' کا جنم ہوا ہے"۔

حقیقتاً ہمیں یہی دیکھنے کو ملا ہے کہ نورِ ایمان سے منور قلوب اکثر فطرت کے حقائق کی دریافت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس سے ان کے ایمان کو مزید تقویت ملتی ہے۔ یہ حیرت انگیز انکشافات خلاقیت کے مظہر بن کر خدا کی پرستش کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ تخلیق کی پیچیدگیوں اور اس کے عمل سے انسان جتنا واقف ہوتا ہے اس کی نظروں میں خالق کا احترام اتنا ہی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ کائنات کی علمیت کے متعلق معلومات جتنی وسیع ہوتی ہے خالقِ کائنات کا عرفان اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

یہ ابھی صرف کل کی بات ہے کہ انسان نے اپنے محیطِ مشاہدہ کو خود سے بہت دور تک بڑھا دیا۔ کل تک انسان کو اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے کمالاتِ تخلیق اور اس کی پیچیدگیوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ آج یکے بعد

دیگرے نئی نئی دریافت سامنے آرہی ہیں۔ دس ملین ملیارڈ (10^{15}) خلیوں سے ایک طبعی جسم انسانی مرکب ہے۔ یہ دریافتیں خالق کی جلالت کی ایسی خبر دیتی ہیں جس کا تصور قبل کے کسی دور نے نہیں کیا تھا۔

کیا یہ قدرتی اسباب، علت، واقعات اور مظاہر فطرت انسان کی رہبری خالق کی جانب نہیں کرتے؟ اس خالق اکبر کی معرفت جس کے ایک لفظ "کُن" کے اثر سے تخلیق مسلسل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا؟

کیا اسے کسی کی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ خدا پر ایمان بس انہیں لوگوں تک محدود ہے جو نظم تخلیق سے بے خبر ہیں۔ یہ فطرت میں رونما ہونیوالے اسباب، تخلیق کے مراحل کو مقرر کرنے والے اسباب، انسانی ارتقا کے اسباب اور طبعی ماحول کی ہر تبدیلی پر حکومت کرنیوالی صحت و صداقت سے باخبر، کوئی سائنس دان یہ یقین کرتا ہے کہ یہ حیرت انگیز قوانین اور تعجب خیز عمل در عمل بے معنی ہیں اور ان کی نمو بے عقل مادہ سے ہوئی ہے؟ کیا ان دریافتوں نے انسان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے اسے عمل در عمل مظاہر میں صرف اندھی موافقت نظر آتی ہے اور اتفاقی تعلق دکھائی دیتا ہے؟

دقیق مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں مادیت کا پھیلاؤ بعض تاریخی حقائق کے سبب ہوا۔ ان میں یقینی طور پر کچھ ذمہ داران کلیسا کی غلطیاں بھی شامل ہیں۔

دورِ بیداری[1] (RENAISSANCE) کے آغاز ہی کے وقت سے ارباب کلیسا نے جدید علوم حاصل کرنے والوں کے خلاف ضرورت سے زیادہ مخالفت شروع کر دی۔

---

[1] یورپ کی تاریخ میں یہ وہ دور ہے جب یونان و مصر کے فلسفوں کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا تھا۔

اس مخالفت کا سبب یہ تھا کہ ارباب کلیسا نے خالص مذہبی عقائد و اصول کے ساتھ ہی ساتھ کائنات کے بارے میں بہت سے نظریہ اپنے قدیم یونانی وغیر یونانی فلاسفہ سے حاصل کئے تھے اور ان کو وہ آبائی وراثت سمجھ کر اس کی مخالفت کو مذہب سے بغاوت کے مترادف سمجھتے تھے۔ لیکن نئی تعلیم نے خلقت کائنات کے متعلق چرچ کے فرسودہ نظریات کو باطل ثابت کردیا۔ چرچ نے کفر کا فتویٰ ان سائنس دانوں پر صادر کردیا جنھوں نے حقائق دریافت کئے تھے اور دریافت کو فارمولوں کی شکل دے دی تھی۔ لہذا لوگ چرچ کے مخالف ہوگئے اور نہ صرف ثانوی نظریات بلکہ عیسائی عقیدہ کو بھی اعتراض کا ہدف بنایا گیا۔ اس ابھرتی ہوئی بغاوت کو بالکل کچل ڈالنے کے لئے چرچ نے اپنے رویئے میں اور شدت پیدا کی۔ دوسری طرف ان لوگوں کے دلوں میں جذبۂ انتقام اُبل پڑا جنھیں خارجی قرار دیا گیا تھا حقائق کو دلیلوں کے ساتھ ثابت کرنے کے بجائے ان لوگوں نے جذبۂ انتقام سے کام لیا۔ اور صاحبانِ علم نے ٹب کے گندے جھاگ کے ساتھ اس میں بیٹھے ہوئے بچہ کو بھی پھینک دیا۔ "نہ صرف دینی مدارس بلکہ خدا کو بھی اکھاڑ پھینکو" پر عمل ہوا۔ کسی مسلک کے ماننے والوں کے خلاف انتقامی کاروائی کرنا اور بات ہے اور مذہبیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا اور بات ہے۔ اسی رمز کو وہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ پھر یہ بات تو ظاہر ہے کہ انتقام ہرگز وسیع النظری اور سائنٹفک ردِ عمل نہیں ہے۔ علمی مباحث میں جذبات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

چرچ نے خدا کے متعلق تعلیم میں بھی خیالی پیکر اور مادی مجسموں کا خوب استعمال کیا۔ بچوں کی گھریلو زندگی سے لیکر مدارس کی تعلیم تک ان خیالی تشبیہات کو شامل رکھا گیا۔ جب یہی بچے بڑے اور تعلیم یافتہ ہوئے تو مطالعہ سے انہیں معلوم ہوا کہ یہ تمام تشبیہات، جھوٹی، غیر سائنٹفک اور مفروضات سے پر ہیں۔ خود انہیں اور نوعِ انسانی کو کافی نقصان ہوا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ مغربی چرچ کی گمراہ کن تعلیمات نے جوانوں کو صراط مستقیم سے مادیت کی جانب موڑ دیا۔ وہ ترقی پسند تحریک کو سمجھنے، خدا کے وجود کے سلسلے میں شبہات کا ازالہ کرنے اور صحیح تصورات پیش کرنے سے قاصر رہے۔ چرچ کو اپنے خیالی نظریات کے سبب بھیانک نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اور انسانیت کا ناقابل تلافی نقصان ہوا۔

ایک امریکی فیزولوجسٹ اور بایوکیمسٹ، "والٹر آسکر لنڈبرگ" لکھتا ہے:۔ "سائنس دانوں کے خدا سے متعلق مشکوک ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں، خاص طور سے:۔

(۱) سیاسی دخل اندازی یا سماجی اور قومی نظریات کا مملکت یا چند اداروں کے ذریعہ تمام وفاداریوں پر فوقیت دیا جانا۔

(۲) ہر نسل کے انسانی خیالات چاہے روحانی ہوں یا طبعی پہلے سے قائم تصورات کے دام میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ خیالات کبھی آزاد نہیں ہوتے، نہ ہی کوئی شخص اپنی پسند میں آزاد ہوتا۔ بلکہ کسی نہ کسی حد تک حالات اور ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور اپنے دور کی روش کو

اپناتا ہے۔

۳۔ خلقتِ انسانی اور مادی تصوّر :- بچوں کے درس میں چرچ کے فرسودہ نظریات اور مادی تصوّرات داخل کردئے گئے تھے۔ مثلاً ایک نصاب کی کتاب کے الفاظ یہ تھے۔ "خدانے انسان کو اپنی ہی شکل کا بنایا ہے"۔ جب ہی بچے سن اور عقل کے لحاظ سے بڑے ہوئے تو انہوں نے خدا کے ہم صورتِ انسان ہونے کے تصور کو غیر منطقی ، غیر سائنٹفک اور مہمل قرار دے دیا خردسالگی کے عقائد اور سائنسی طریقۂ فکر میں ہم آہنگی نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے سرے سے خدا ہی کے تصور کو برطرف کردیا۔ بجائے اس کے کہ وہ سائنس اور تحقیق کی روشنی میں اپنے عقائد اور تصور پر نظرِ ثانی کرتے رفیع تر علم وعقل کی میزان پر اپنے خیالات کو تول کر دیکھتے اور اپنے عقیدہ کی تصحیح کرتے۔ بچپنے سے کام لے کر انھوں نے یک لخت پورے عقیدہ کو ہی مسترد کرڈالا[1]۔

ایک چوتھا سبب سنیاس اور تجرد کی زندگی کی تبلیغ بھی ہے۔ انسان میں کچھ طبعی خصوصیات ہیں جنھیں قدرت نے اس کی فطرت میں ودلیعت کیا ہے۔ اور یہ بے کارِ محض نہیں ہیں۔ ان کا مقصد تخلیق کی افزائش ہے۔ مگر انسان کو انہیں کا غلام بنے رہنا بھی نہیں چاھئے ۔

---

[1] "اثباتِ خدا...." صفحہ ۶۰ "The Evidenc of God in an Expanding Universe Pg. 60"

دنیا کے ممتاز چالیس سائنس دانوں کے مختصر مختصر مضامین کا انتخاب۔

مرتب کردہ : جان کلو درمان سوما "John Clover Monsma"

نہ ہی اس کی جانب سے آنکھیں بند کرلینا ہی صحیح ہو سکتا اس طور پر کہ اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ کسی بھی فطری قوت کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دینا یا اس سے قطعی پرہیز اختیار کرلینا دونوں درست نہیں۔ ان قوتوں کی واقفیت اور ان کا صحیح استعمال انسان پر فرض ہے۔ ان پر مناسب کنٹرول رکھنا بھی ضروری ہے۔ دین و اللہ کے نام پر فطری تقاضوں کو برائی سمجھنا سنیاس اور تجرد کی زندگی کو شرع کا لبادہ پہنانا، شادی بیاہ کو غیر شرعی قرار دینا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ جبکہ نوعِ انسانی کی بقا خاندانوں کی بنیاد ہی پر قائم ہے۔ ہر طرح کے جنسی ارتباط کو گندگی اور بے دینی کہنا، جہل و افلاس کو جائز قرار دینا اور یہ دعویٰ کرنا کہ انسان دنیاوی لذات چھوڑنے کے بعد ہی اخروی اور روحانی خوشیاں حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سب ایک زبردست بھول ہے اور سنگین ترین بدعتوں کے گڑھے میں گر جانے کے مترادف ہے۔ مذہب کا کام ان جبلی قوتوں کا ادراک کرنا ہے، ان کے فلاحی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے، ان کا دائرہ کار معین کرنا ہے اور ان کیلئے نظم و ضبط کے عنوان سے حدیں مقرر کرنا ہے ان فطری قوتوں کا انکار یا ان کو پامال کرنا مذہب کا مقصود نہیں ہے۔ قدرت نے انسانی فطرت کی تخلیق میں جسمانی اور روحانی ہر دو جنبوں کا لحاظ رکھا ہے۔ دونوں کے درمیان توازن ہونا چاہئے۔ فطرت کے لئے دونوں لازم ہیں، البتہ ان میں فوقیت کی جنگ نہیں ہونی چاہئے۔ اگر ان میں تناسب و توازن رکھا جائے تو یقیناً انسان کی زندگی فطری، منطقی اور خوشگوار ہے۔

اس دنیا اور آخرت کی خوشیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عیسائیت کے مبلغین کا یہ اعلان کہ انسان دنیا و آخرت میں سے بس کسی ایک ہی کو پا سکتا ہے "آخرت کی خوشیوں کے لئے دنیا کو تجنا ضروری ہے"، ایسی سنگین غلطی تھی جس کے سبب نوجوان نسل چرچ کی تعلیمات کی مخالف ہوگئی اور بغاوت نے زور پکڑنا شروع کیا۔ بہت سارے لوگوں کا ان عقائد سے باغی ہوجانا از روئے انصاف غلط بھی نہ تھا۔ یہ نوجوان کلیسائی قانون کا یہ کہکر مذاق اڑاتے تھے کہ اہل کلیسا ہم سے تو کہتے ہیں "PIE INTHE SKY BY AND BY" "آسمانی نعمتیں رفتہ رفتہ ملیں گی"۔ مگر ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ہم انھیں اپنے استحصال کی اجازت فوراً دیدیں۔ یہ لوگ ہمیں معمولی چیزوں کی طرح استعمال کرتے رہیں تاکہ اس طبقے کی ترقی ہوتی رہے جو خود اُخروی مفاد کی خاطر تارک الدنیا ہونے سے بہت دور ہے۔ انھیں غیر فطری عقائد و نظریات نے مادیت کو بہت بڑھا وا دیا اور دین کو بالکل مفلس بنا کر چھوڑ دیا۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ آیا چند لغو تفریحات جیسے جوئے بازی، شراب خواری یا زناکاری وغیرہ؟ جو دنیا کو فساد اور ظلمت میں ڈال دیتی ہیں مذہب نے ان چیزوں پر اسی لئے بندش لگائی ہے کہ یہ چیزیں دنیا وی خوشی کو تباہ کردیتی ہیں۔ یہ باتیں نہ صرف ان کے لئے باعث افلاس ہیں جو ان افعال قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ اس معاشرہ اور ماحول کے لئے بھی مضرت رساں ہیں جس میں ایسے لوگ زندگی گذارتے ہیں۔ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ انسان دنیاوی مسرت یا اخروی فرحت میں سے کسی

ایک کو ہی منتخب کر سکتا ہے ۔حیات اُخروی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے ۔ دنیا کی فطری آسائشیں اور اخروی سرخوشی دونوں ہی اس دنیا میں زندگی گزارنے کے سلیقہ میں مضمر ہیں ۔

اسلامی شریعت نے اعمالِ انسانی کو پانچ بنیادی خانوں میں تقسیم کیا ہے ۔ان میں ارفع ترین درجہ واجبات کا ہے ۔یعنی وہ فرائض جنھیں ہر ایک کے لئے بجالانا ضروری ہے ۔ ان میں خدا کی عبادت ، اعمالِ صالحہ کی تلقین اور خوش کرداری بالکل فطری امور ہیں۔ ان کو حق حاصل ہے کہ انھیں واجبات میں جگہ دی جائے ۔ ان کا مقصد اہل زمین میں خوشحالی پیدا کرنا نہیں ہے ۔ بلکہ ان اعمال کے نتیجہ میں دنیا کی راحتیں خود بخود میسر ہوتی ہیں ۔ان کی بجا آوری ضمیر کی آواز اور خدا کا حکم سمجھ کر ہوتی ہے ۔کیوں کہ یہ فطرتِ انسانی کا بہترین مظاہرہ ہے ۔خدا نے اسے اسی طرح بنایا ہے ۔ انسان کو جو کچھ حاصل ہے یہ عبادت اس کے عوض میں نہیں ہوتی ۔ عبادت انسان کی تربیت اور حفاظت کرتی ہے ۔ اس میں صفائے قلب کی ایسی قوت ہے جو بدکرداری کو دھو ڈالتی ہے ۔اور انسانی فطرت کو تقویت بخشتی ہے ۔ اسی لئے اخلاقی مسائل اور عملی زندگی کے مسائل میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا ۔کیونکہ اخلاقی اصول کامیاب زندگی کے لیے مشعلِ راہ بنتے ہیں ۔

ممکن ہے غیر منطقی تعلیمات اور گمراہ کن عقائد برٹرانڈ رسل جیسے مفکرین کو خدا کا منکر بنا دیں ۔خدا سے انحراف کو خوشی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے رسل لکھتا ہے "چرچ کے عقائد نے انسان کو دو مصیبتوں کے درمیان لٹکا رکھا

ہے۔ ان میں سے کوئی ایک ضرور انسان کا مقدر رہے۔ یا تو وہ ارادتاً ایسے امور کو ترک کر دے جو دنیا کی تمام خوشیوں اور مسرتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں یا دنیوی عیش و عشرت کی طرف قدم تو بڑھائے لیکن اس خوف کے ساتھ کہ آخرت کی شادمانیاں اب اس کے نصیب میں نہیں ہیں"۔

رسل کا نظریہ بالکل ہی غلط ہے۔ حقیقی مذہب یہ ہرگز نہیں بتاتا کہ انسان کو دو میں سے ایک مصیبت پالنی ہی ہوگی۔ خدا کی رحمت و قدرت بے کراں ہے۔ اس کی رحمت کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس کی مرضی یہ ہے کہ اس کے بندے دنیا و آخرت دونوں جہاں کی خوشیاں حاصل کریں۔

مکمل چھوٹ اور بے لگامی بھی مادیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور یہ بھی دہریت کو جنم دینے کا باعث بنی ہے۔ یہ نظریات ہی ہیں جو کردار کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ خدا پرستی کا خیال انسان کی روح کو رفعت بخشتا ہے اور انسان کے خلوص کو تازگی عطا کرتا ہے نیز صاف ستھری آب و ہوا اور صحت مند زندگی کا ضامن ہے۔

●